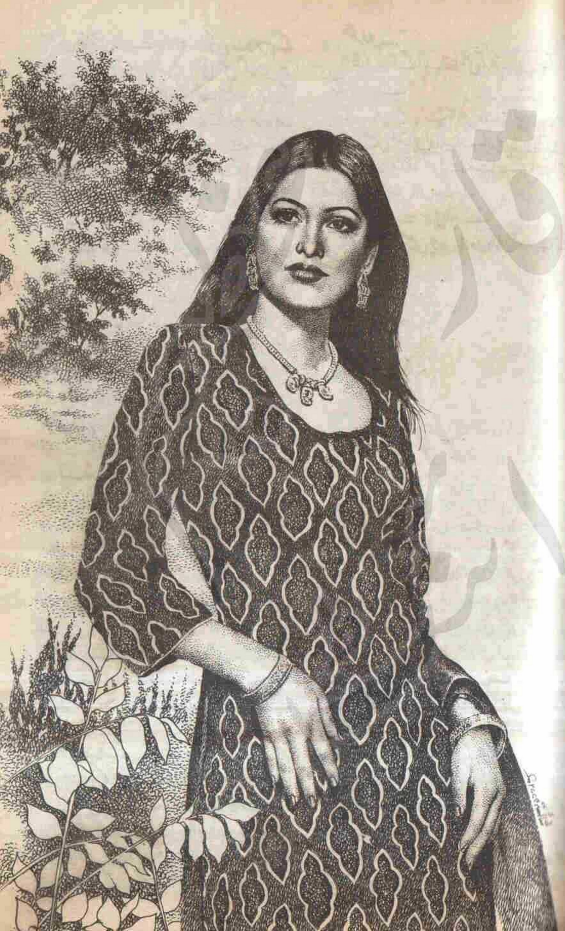

ممتاز کنول

اک داغ سہی

ناولٹ

ایک شور ایک ہنگامہ سا برپا تھا‘ اسے پڑھنے کے لیے جس یکسوئی کی ضرورت تھی وہ مفقود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس نے پھر بھی دماغ کو حاضر رکھتے ہوئے کتاب پر نظریں مرکوز کرنے کی کوشش کی مگر لاحاصل۔ اس نے کتاب بند کر کے ٹیبل پر پٹخی اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا کر اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور انتظار کرنے لگا کہ باہر سے آتی آوازیں بند ہوں تو دوبارہ کتاب کھولے مگر باہر ہونے والا شور بجائے کم ہونے کے مزید بڑھ گیا اور اب تو اماں کی آواز بھی آ رہی تھی۔ وہ کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا اور تن فن کرتا ہوا دروازے میں جا کھڑا ہوا۔

”اماں... اماں! دیکھیں نا‘ اس نے مجھ سے کہا۔ میں تمہارے لیے ٹافی لایا ہوں‘ ہاتھ پھیلاؤ اور میں... میں نے جب ہاتھ پھیلایا تو اس نے نا میرے ہاتھ میں چھپکلی رکھ دی۔“

زرتاج کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ کانپ بھی رہی تھی جبکہ حارث‘ ثوبیہ اور ردا پیٹ پکڑے بے تحاشا ہنس رہے تھے۔ گزشتہ دس منٹ سے ہونے والا ہنگامہ اسی وجہ سے تھا۔ زرتاج کی ہولناک چیخوں نے عزم کے دماغ کی چولیں تک ہلا ڈالی تھیں۔ اماں نے آستین سے ناک اور آنکھیں پونچھتی زرتاج کو سینے سے لگا لیا۔

”حارث کے بچے! خدا تجھے سمجھے۔ دیکھ تو بچی کا دل کیسا دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔“

”اماں! یہ دیکھو‘ یہ چھپکلی ہے‘ ننھی سی۔“

حارث نے دم پکڑ کر چھپکلی اماں کے آگے لہرائی تو اماں بے چاری بھی دہل کر پیچھے ہو گئیں۔ بچے دوبارہ کھی کھی کرنے لگے۔

”کیسی ناپاک چیز کو پکڑ رکھا ہے‘ چھی گندا۔ جاؤ پھینکو اسے اور جا کر اچھی طرح ہاتھ دھوؤ۔“

”اماں! نقلی ہے‘ ربر کی۔“ حارث شرارت سے آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔

عزم دانت کچکچاتے ہوئے واپس کمرے میں چلا آیا۔ یہ ایک دن کی بات نہیں تھی‘ یہاں تو روز کا

معمول تھا جس دن سے یہ مصیبت کی پوٹ (عزم کے خیال کے مطابق) اس گھر میں آئی تھی' گھر میں جو سکون تھا' وہ بھی درہم برہم ہو گیا تھا۔ پہلے ہی بچوں کی تعداد کیا کم تھی۔ آدھا درجن بچے تھے' جو گھر کو ہمہ وقت میدان جنگ بنائے رکھتے تھے۔ ذرا جو سکون ہو گھر میں۔ چھوٹا سا گھر اور آٹھ افراد کا کنبہ۔ پھر اماں' بہن کے فوت ہونے کے بعد زرتاج کو بھی اٹھا کر لے آئیں۔

جب وہ اماں کے ساتھ آئی تو دس گیارہ سال کی تھی۔ اول درجے کی احمق اور بزدل لڑکی۔ سانولا رنگ اور مرگھلا سا وجود۔ اس کے آنے پر سب سے زیادہ اعتراض عزم کو ہی ہوا تھا۔ وہ انتہا درجے کا پڑھاکو بچہ تھا (شکر ہے کہ عینک نہیں لگی تھی) اور جس زمانے میں زرتاج ان کے گھر آئی' وہ نویں میں تھا۔ شروع سے ہی اس کا رجحان میڈیکل کی طرف تھا۔ وہ ہارٹ سرجن بننا چاہتا تھا اور اس کے لیے' بہت زیادہ محنت کی ضرورت تھی۔ گھر میں کل تین تو کمرے تھے' جس میں سے ایک تو بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا' باقی کے دونوں کمروں میں ہر وقت بچوں کا آنا جانا لگا رہتا بلکہ پورے گھر کو ہی چھوٹے بہن بھائی اکھاڑا بنائے رکھتے۔ عزم تو پڑھنے کے لیے کونے کھدرے ہی ڈھونڈتا رہ جاتا اور پھر ستم یہ کہ اماں' زرتاج کو لے آئیں۔ اس کے آنے پر عزم نے تو باقاعدہ واویلا مچایا تھا۔

"کیوں لے کر آئی ہیں آپ اسے' اس کے چچا وغیرہ لے جاتے۔"

اماں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ "اے بچے! تجھے کیا تکلیف ہے؟"

"اتنا چھوٹا سا گھر ہے' اتنی کم آمدنی ہے ابا کی۔ ہم لوگوں کو ہی پورا نہیں پڑتا' آپ ایک اور مصیبت کو اٹھا کر لے آئیں۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"گھر چھوٹا ہے تو کیا ہوا' دل بڑا ہونا چاہیے اور بیٹا! وہ جو کچھ کھائے گی اپنے نصیب کا کھائے گی۔ تیرے حصے سے نہیں کھائے گی۔"

"مگر اماں۔۔۔"

"خبردار جو آگے ایک لفظ بھی کہا تو۔ جا۔۔۔ جا کر اپنی کتابوں کو چاٹ۔"

عجیب ماں تھیں' بچے کا اس درجے کتابوں پر توجہ دینا بھی انہیں کھلتا تھا اور یہ بات کچھ یوں صحیح بھی تھی کہ وہ گھر کا بڑا بیٹا تھا' تھوڑے' بہت باہر کے کام نپٹا سکتا تھا مگر توبہ کرو' جہاں اماں نے کہا۔

"جا ذرا بازار سے سبزی لا دے۔"

جواب ملتا۔ "میں پڑھ رہا ہوں اماں! حارث سے منگوا لیں۔"

"یہ بل جمع کروا دو۔"

"میں پڑھ رہا ہوں۔"

"دال لا دو۔"

"پڑھ رہا ہوں۔"

"آٹا لانا ہے۔"

"میں پڑھ رہا ہوں۔"

"چھوٹی بہن کو سلا دو۔"

"میں پڑھ رہا ہوں۔"

اور پھر اماں خود ہی سر پر برقعہ ڈال کر گلی گلی سودا لانے کے لیے رلتی رہتیں۔ ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے انہیں خود ہی بازار کے چکر لگانے پڑتے۔

اسے چاہیے تھا' اچھا کھانا' اچھا پہننا اور پڑھنے کے لیے پرسکون ماحول۔ اول الذکر دونوں خواہشیں تو کسی نہ کسی طور روپیٹ کر پوری ہو جاتی تھیں مگر تیسری خواہش کے لیے وہ بس دل مسوس کر رہ جاتا یا پھر امتحانوں کے دنوں میں اپنے دوستوں کے گھر کا رخ کرتا جس کے گھر کافی بڑے تھے۔ وہ جس ماحول میں رہتا تھا اس سے ہمیشہ کبیدہ خاطر نظر آتا۔ ابا کا دکان پر بیٹھنا اسے ایک آنکھ نہ بھاتا۔ "کاش کہ میرا باپ بھی کوئی بڑا بزنس مین ہوتا یا پھر کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم ہوتا۔ کتنی عزت ہوتی سب لوگوں کے سامنے۔" وہ حسرت سے سوچتا۔

اسے ایک ہی لگن تھی بلکہ جنون تھا کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے اور معاشرے میں ایک بلند مقام

حاصل کرے اور پھر لوگ اسے رشید پرچون والے کا بیٹا کہنے کے بجائے ڈاکٹر عزم الحق کے نام سے پہچانیں۔ سو وہ یہ مقام حاصل کرنے کے لیے تن من دھن سے جتا ہوا تھا' ذہین بھی بہت تھا' اس لیے ہمیشہ امتیازی نمبروں سے پاس ہوتا۔ باقی دوسرے بچے تو پڑھائی میں بس نارمل ہی تھے۔

زرتاج بھی ان ہی بچوں جیسی تھی۔ اسے اس گھر میں آئے سال ہونے کو آیا تھا مگر عزم نے اسے ابھی تک گھر کا فرد تسلیم نہیں کیا تھا۔ باقی کی دونوں بہنیں اور بھائی اسے اپنی بہن ہی سمجھتے تھے بلکہ حارث کی تو اس کے ساتھ گاڑھی چھنتی تھی۔ حارث اس کا خیال بھی خوب رکھتا اور نوک جھونک بھی خوب کرتا اور ستاتا بھی بے پناہ تھا۔ وہ جتنی ڈرپوک تھی حارث اسے اتنا ہی ڈراتا۔ کبھی چھپکلی سے' کبھی کاکروچ سے اور کبھی طرح طرح کے ماسک لگا کر۔ اس کے ہاتھ سے چیزیں چھین جھپٹ کر وہ کھا جاتا' زرتاج روتی چلاتی رہ جاتی اور وہ ساری کی ساری چیز ہڑپ کر جاتا۔

روز شام کو بڑے سے برآمدے کو اسٹیڈیم بنا دیا جاتا اور پورے جوش و خروش سے کرکٹ کھیلی جاتی۔ ایک اودھم' ایک ہنگامہ برپا رہتا۔ جب تک عزم باہر نکل کر ان سب کے دو دو جھانپڑ رسید نہ کر دیتا' ہنگامہ سرد نہ ہوتا۔ حارث تو کھسک جاتا' زرتاج اور چھوٹوں کی شامت آ جاتی۔ دو چار دفعہ تو اس نے زرتاج کو بھی تھپڑ جڑ دیے تھے اور ایسا کر کے اسے حد درجہ سکون ملتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن وہ پرچہ دے کر آیا تھا' حالانکہ سب کچھ یاد تھا۔ اچھی خاصی محنت بھی کی تھی مگر پھر بھی کوئی کمی سی رہ گئی تھی جو پرچہ اس کی توقع کے مطابق نہیں ہوا وہ چڑا سا ہو رہا تھا۔ اپنے آپ سے الجھتے ہوئے وہ گھر آیا اور گھر کے اندر قدم رکھتے ہی زرتاج بیگم سے سامنا ہو گیا۔ حارث نے زرتاج کی گڑیا توڑ دی تھی اور وہ منہ پھاڑ کر رو رہی تھی۔

"گیارہ سال کی لڑکی کچھ تو عقل ہونا چاہیے۔ یہ کیا کہ ہر وقت یا تو گلا پھاڑ کر روتے ہوئے ملے گی یا پھر چیخ چیخ کر بےسرے و بے تکے گانے گاتے ہوئے۔" ایک تو گرمی پھر پرچہ خراب ہونے کا غم اور پھر ناپسندیدہ ترین ہستی کا شور و غل' وہ بھنا گیا۔

"منہ بند کرو اپنا۔" وہ زور سے چیخا۔ زرتاج نے گڑبڑا کر دوپٹے سے آنسو صاف کرتے ہوئے دائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی گڑیا اس کے آگے کر دی۔

"یہ دیکھیں بھائی! حارث نے میری گڑیا کی ٹانگ توڑ دی۔ میں نے جیب خرچ جمع کر کے یہ باربی لی تھی۔" اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

اس کے ہاتھ سے باربی جھپٹ کر عزم نے اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ کر اسے دور اچھال دیا۔ "بہت اچھا کیا اس نے' تمہارے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔"

زرتاج کا تو گویا دم ہی نکل گیا۔ وہ رونا چاہتی تھی مگر عزم کے ڈر کی وجہ سے رو نہیں سکتی تھی' اس لیے منہ اور آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

"یہ کوئی تمہاری گڑیاں کھیلنے کی عمر ہے۔ مفت کی روٹیاں توڑتی رہتی ہو' اماں کے ساتھ کام کیا کرو۔"

خالص سوتیلی ماؤں والا جملہ بول کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ حارث جو بھائی کو دیکھتے ہی چھپ گیا تھا' اس کی گڑیا اٹھائے پھر آموجود ہوا۔ اسے دیکھتے ہوئے جیسے ہی زرتاج نے منہ کھولنا چاہا' حارث نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خبردار رونا نہیں' بھائی آ کر تمہارا گلا دبا دیں گے اور سوری یار! میں نے تو مذاق کیا تھا۔ یہ بھائی تو بالکل جلاد ہیں۔ میں تمہیں کل ہی نئی باربی لا دوں گا۔"

اس کی بے چاری سی شکل دیکھ کر حارث کو رحم آ گیا۔

"پرامس۔۔۔ لیس پرامس۔" اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

زرتاج نے ثوبیہ اور ردا کے اسکول میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ ثوبیہ اور ردا تیسری کلاس میں تھیں جبکہ اس نے پانچویں میں ایڈمیشن لیا تھا۔ وہ داخل ہونے کو تو

ہوگئی تھی مگر اسے پڑھائی سے دلچسپی برائے نام ہی تھی۔ پتا نہیں کس طرح رو پیٹ کر پانچ کلاسیں پاس کی تھیں۔ ہر وقت بھاگ دوڑ کرنا۔ پڑوسیوں کے درخت سے امرود توڑ کر کھانا' ثوبیہ اور ردا کے ساتھ بے ہنگم قہقہے لگانا' مختلف قسم کے فضول کھیل کھیلنا یا پھر لمبی تان کر سو جانا۔ یہ تھے اس کے پسندیدہ مشاغل۔ عزم نے تو اسے کبھی کتابوں کو ہاتھ لگاتے نہیں دیکھا تھا۔ ثوبیہ اور ردا تو پھر بھی پڑھ لیتی تھیں جبکہ حارث اور وہ تو اسکول بھی مارے باندھے جاتے۔ صبح اٹھ کر تیار ہونا ہی اس کے لیے عذاب تھا۔ اماں دس آوازیں دیتیں' تب کہیں جا کر وہ اٹھتی۔ یونیفارم پہن کر جب وہ ناشتے کے لیے سب کے ساتھ بیٹھتی تو بھاڑ سا منہ کھول کر جمائیوں پر جمائیاں لیے جاتی۔ اس کی ہر جمائی پر عزم کا ایک کلو خون جل جاتا۔ اس کے لیے ناشتہ کرنا دوبھر ہو جاتا۔ مگر اس وجہ سے دل مار کر بیٹھا رہتا کہ اماں کچھ زیادہ ہی اس کے لاڈ اٹھاتی تھیں یہ کہہ کر کہ "یتیم بچی ہے بے چاری۔"

خدا خدا کر کے عزم کے پیپرز ختم ہوئے اور پورے گھر میں جو ایک تناؤ کی سی کیفیت طاری تھی' وہ ختم تو نہ ہوئی مگر اس میں کچھ کمی ضرور واقع ہو گئی تھی۔

"آئیں بھائی! کرکٹ کھیلتے ہیں۔" عزم کا موڈ کچھ خوشگوار دیکھ کر حارث نے پیش کش کی۔

وہ بھی فارغ ہی تھا' چنانچہ تیار ہو گیا۔ برآمدے میں وکٹیں وغیرہ سب تیار تھیں۔ ثوبیہ' ردا اور زرتاج اپنی اپنی پوزیشن سنبھالے کھڑی تھیں۔ بچوں کا دل رکھنے کے لیے وہ کھیلنے تو آگیا تھا مگر زرتاج کو دیکھ کر اس کا منہ کڑوا ہو گیا اور سب باتوں میں خواہ وہ سب صفر ہوں مگر کرکٹ بہت اچھی کھیلتے تھے۔

زرتاج کی بولنگ کا تو جواب نہیں تھا۔ اس وقت وہ عزم کو بولنگ کروا رہی تھی' جب عزم نے چھکا مارنے کے لیے زبردست ہٹ لگائی۔ چھکا تو نہیں لگا' البتہ سیدھی جا کر زرتاج کے منہ پر لگی تو اس کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ ردا' ثوبیہ اور حارث پریشان ہو کر اس کی طرف دوڑے جبکہ وہ وہیں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

حسب معمول وہ گلا پھاڑ کر رو رہی تھی۔ اماں بھی کچن سے نکل کر آگئیں۔ خون دیکھ کر وہ گھبرا گئیں۔ اسے پکڑ کر نلکے کے پاس لاتے ہوئے وہ بلند آواز میں اپنے بچوں کو کوس بھی رہی تھیں۔

"بھائی! آپ نے جان بوجھ کر اسے بال ماری ہے نا؟" حارث کہاں چھوڑنے والا تھا۔ اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا' میں کیوں جان بوجھ کر ماروں گا۔" اس نے ڈپٹ کر کہا۔

"مجھے پتا ہے آپ اس سے چڑتے ہیں۔ آپ نے جان بوجھ کر اسے بال ماری ہے۔"

"دماغ صحیح ہے تمہارا۔ میں نے تو چھکے کے لیے ہٹ لگائی تھی۔"

زرتاج کا منہ سوج گیا تھا۔ اماں اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں اور جب ڈاکٹر کے ہاں سے واپس آئیں تو وہ بھی یہی سوال لیے اس کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

"لاحول ولا قوۃ۔" وہ بھنا گیا۔ "خدا کی قسم اماں! میں نے جان بوجھ کر نہیں مارا اسے۔"

"اچھا نہیں مارا ہو گا۔ یہ تو حقیقت ہے نا کہ تم اس بچی سے خوامخواہ چڑتے ہو۔"

"خوامخواہ نہیں چڑتا' وہ حرکتیں ایسی کرتی ہے۔"

"کیا کرتی ہے مثلاً—"

"ہر وقت اچھل کود' رونا چلانا' اونچی آواز میں گانے گانا۔ یہ عمر ہے اس کی ایسی حرکتوں کی۔"

"بوڑھی نہیں ہے جو سنجیدگی کا چولا پہن لے۔ گیارہ بارہ سال کی تو ہے۔"

"ردا اور ثوبیہ بھی تو ہیں' اس سے چھوٹی ہی ہیں' وہ تو نہیں کرتیں اتنی ہلڑ بازی۔" اس نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

"کرتی ہیں وہ بھی' کیوں نہیں کرتیں۔ بس تمہیں نظر نہیں آتا' اس لیے کہ تم صرف اس سے خار کھاتے ہو۔ ہر وقت اس کے متعلق منفی انداز میں سوچتے رہتے ہو' اس کی ہر بات کو نوٹ کرتے ہو۔ بے چاری کی ماں نہیں ہے' باپ نے دوسری شادی کرلی

ہے۔ کیسے اسے سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ دو وقت کا کھانا کھاتی ہے' تمہارا تو کچھ نہیں بگاڑتی۔ عمر کے ساتھ ساتھ عقل بھی آ ہی جائے گی۔"

اماں نے سمجھایا مگر عزم کو تو جیسے پختہ یقین تھا کہ اسے عقل کبھی نہیں آئے گی۔

☼ ☼ ☼

انٹر میں عزم کے پچاسی فیصد نمبر آئے تھے اور وہ ٹیسٹ میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ سو اس نے میڈیکل کالج جوائن کر لیا۔ سب ہی لوگ خوش تھے۔ خود اس کی اپنی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ اب اسے اپنا روشن مستقبل سامنے نظر آرہا تھا۔ اس کے عزائم اور حوصلے میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ان دنوں میں وہ اپنی ذات میں گم اور بہت مطمئن نظر آتا تھا۔

رمضان شروع ہونے والے تھے' اماں' بچوں کے لیے رمضان سے پانچ چھ دن پہلے ہی عید کی خریداری کر لیا کرتی تھیں۔ ہاں چوڑیاں' چپل اور دوسری چھوٹی موٹی چیزیں رمضان کے آخری دنوں میں بچوں کو ساتھ لے جا کر دلاتیں۔ تینوں بچیوں کے لیے وہ دو دو جوڑے کپڑے لاتیں اور یہ چھ عدد جوڑے اماں نے عزم کی نظروں کے سامنے زرتاج کے آگے رکھ دیے تھے کہ پہلے وہ اپنے لیے کپڑے پسند کر لے۔ ردا اور ثوبیہ بھی وہیں موجود تھیں اور بڑے اشتیاق کے ساتھ کپڑے دیکھ رہی تھیں۔ زرتاج نے بڑے مزے سے اورنج اور پیرٹ گرین کلر کے سوٹ اٹھا لیے۔ سب جوڑوں میں وہی دونوں جوڑے سب سے زیادہ خوبصورت تھے۔ دونوں بچیاں حسرت سے اس کے ہاتھ میں پکڑے جوڑے دیکھ رہی تھیں اور وہ اتراتے ہوئے اٹھی اور ایک بھرپور مسکراہٹ جلتے بھنتے عزم کی طرف اچھالی۔ عزم کے برداشت کی حد ختم ہو گئی۔ وہ بل کھا کر اٹھا تھا۔

"اماں! یہ کیا ناانصافی ہے' حد کرتی ہیں آپ بھی۔ لوگ اپنی اولاد کو آگے رکھتے ہیں اور آپ اپنی بچیوں کو ڈی گریڈ کر کے اس ناشکری لڑکی کو آگے کر رہی ہیں۔ ان کپڑوں پر پہلا حق میری بہنوں کا ہے' پہلے میری بہنیں کپڑے پسند کریں گی پھر اس کو کپڑے ملیں گے۔"

زرتاج کے ہاتھ سے کپڑے جھپٹ کر اس نے اماں کے آگے پھینک دیے اور بکتا جھکتا کمرے سے نکل گیا۔ اماں اس کے اس انداز پر ہکا بکا سی بیٹھی تھیں جبکہ زرتاج کے خالی ہاتھ وہیں ہوا میں معلق رہ گئے۔ اماں اٹھ کر اس کے قریب آگئیں۔

"دل چھوٹا نہ کر زری! یہ کپڑے تیرے ہی ہیں۔ ردا اور ثوبیہ کو تو اپنے اپنے جوڑے بہت پسند آئے ہیں۔ عزم تو بے وقوف ہے۔"

"ہاں... ہاں باجی! ہمیں اپنے کپڑے بہت پسند آئے ہیں۔" وہ بچیاں بھی صابر و شاکر بچیاں تھیں۔

"خالہ امی! میں نے تو صرف بھائی کو چڑانے کے لیے یہ دونوں جوڑے اٹھائے تھے' ورنہ آپ مجھے جو جوڑا دے دیں گی' میں وہ لے لوں گی۔ یہ پیرٹ گرین سوٹ تو ثوبیہ پر بہت اچھا لگے گا اور اورنج کلر ردا پر سوٹ کرے گا۔"

صبح کو سارے بچے اسکول سدھارے۔ ابا دکان پر چلے گئے۔ گھر میں اماں اور عزم ہی تھے۔ عزم کی کلاسیں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ اماں اس کے لیے پراٹھا اور آملیٹ بنا کر لائیں۔ وہ برآمدے میں تخت پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اماں نے ناشتے کی ٹرے اس کے آگے رکھی اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔ عزم نے اخبار پر سے نگاہ ہٹا کر انہیں دیکھا' وہ جیسے کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔

"کیا بات ہے اماں! کچھ کہنا ہے کیا؟" نوالہ توڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"کیا کہوں بچے! تجھ سے کچھ کہنا پتھر سے سر ٹکرانے کے مترادف ہے۔ تجھ پر میری باتوں کا کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔" اماں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

"کیوں اماں! ایسی کیا بات ہو گئی؟"

"رات تو نے کتنی بری حرکت کی' کس طرح بچی کا دل دکھایا' احساس ہے تجھے۔"

"میں نے دل دکھایا، بچی کا۔" ہاتھ میں پکڑا نوالہ اس نے پلیٹ میں پٹخ دیا۔ "اس بچی (دانت کچکچائے) کو نہیں دیکھتیں، کیسی حرکتیں کرتی ہے، کتنی زیادہ خودغرض ہے، کس طرح اپنا حق سمجھ کر کپڑے اٹھا لیے۔ ذرا مروت اور لحاظ نہ کیا اور آپ... آپ ہم سب کی حق تلفی کرتی ہیں۔ ہر اچھی چیز پہلے اس کے آگے آتی ہے پھر ہمیں ملتی ہے۔ سالن سب سے پہلے آپ اس کے لیے نکال کر رکھ دیتی ہیں، فروٹ اس کے لیے الگ نکال کر رکھا جاتا ہے۔ کیا ہم اس کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔ لگتا ہے، ہم سب آپ کے سوتیلے ہیں اور وہ آپ کی سگی ہے۔ الٹی گنگا بہہ رہی ہے یہاں تو۔" وہ تو پورا جلا بیٹھا تھا۔

"کیا فائدہ تیرے اتنا پڑھنے کا، کیا یہی سب پڑھایا جاتا ہے تجھے۔ کیا تجھے نہیں پتا کہ ایک یتیم کے کیا حقوق ہوتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے والا اور میں، اس طرح ہوں گے جیسے کہ شہادت کی اور درمیان والی انگلی۔ تو کیا سمجھتا ہے، مجھے نہیں پتا اپنی اولاد کے حقوق کا، مگر عزم میں یتیم کے معاملے میں اپنے اللہ سے ڈرتی ہوں۔ کہیں بھی، کبھی بھی اس کی دل آزادی نہ ہو جائے۔ جس بچی کی ماں نہیں، باپ اس کے لیے جیتے جی مر گیا۔ پوچھتا تک نہیں، وہ بچی یتیم ہی ہوئی۔ میں اگر اس کے ساتھ مہربانی کا سلوک کروں گی تو اللہ اس کے صلے میں میرے بچوں کو پھل دے گا۔ ان کے لیے آسانیاں پیدا کرے گا، ان کے مرتبے بلند کرے گا، تجھے کیا پتا کہ جب میں اس کی شکل دیکھتی ہوں تو مجھے اپنی چھوٹی بہن کتنا یاد آتی ہے۔ وہ جو جوانی میں فوت ہو گئی اور کتنی مفلسی میں اس نے زندگی بسر کی۔ اپنی بہن کی طرح میں اس کی بیٹی کو ترستے نہیں دیکھ سکتی۔ میرا دل چاہتا ہے، دنیا کی ساری خوشیاں اس کے آگے ڈھیر کر دوں اور اسے کانٹا بھی چبھنے نہ دوں۔" اماں کی آنکھیں جھلملا گئیں۔

بالآخر اس نے زرتاج سے چڑنا چھوڑ دیا، اس کا سامنا بھی کم سے کم کرنے لگا۔ ویسے بھی اب اس کے پاس فرصت کے لمحات کم ہی ہوتے تھے۔ آٹھویں کلاس میں زرتاج کے نمبر اور پرچوں میں تو اچھے خاصے آئے تھے۔ البتہ انگلش میں بہت کم نمبر تھے، فیل ہوتے ہوتے رہ گئی تھی اور اس بات کا اسے بہت رنج تھا۔ حالانکہ عزم کے خیال میں وہ چاہتی تو بہت اچھے طریقے سے پڑھائی کر سکتی تھی کیونکہ اس کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ گھر کے چھوٹے موٹے کام ردا اور ثوبیہ کر دیتی تھیں جبکہ کھانا اماں پکاتی تھیں۔ کپڑوں کی دھلائی وغیرہ بھی وہی کرتی تھیں۔ بظاہر تو عزم کو یہی نظر آتا تھا کہ وہ فارغ ہی فارغ ہوتی ہے مگر حقیقتاً زرتاج اسکول سے آ کر اماں کا اچھا خاصا ہاتھ بٹا دیتی تھی۔

ابا آتے تو بھاگ بھاگ کر ان کے کام کرتی، انہیں چپل دیتی، نہانے کے لیے پانی گرم کر کے دیتی، کھانا ان کے آگے رکھتی، رات کو ان کی ٹانگیں دباتی مگر عزم کے سامنے وہ جان بوجھ کر خود سے اٹھ کر پانی بھی نہ پیتی۔ عزم کو اسی بات کا غصہ تھا۔

کم نمبر آنے پر اماں نے اسے ملول سا دیکھا تو ان کے دماغ میں یہ بات آئی کہ اگر عزم اسے ایک گھنٹہ پڑھا دے تو کتنا اچھا ہو اور جب انہوں نے عزم سے یہ بات کہی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

"میرے پاس ٹائم نہیں ہے، میری پڑھائی خود اتنی ٹف ہے۔"

"بیٹا! صرف ایک گھنٹے کی تو بات ہے۔"

"نہیں اماں! اول تو میرے پاس وقت نہیں ہے۔ دوسرا زرتاج جیسی بے ڈھنگی لڑکی کو تو میں قطعی نہیں پڑھا سکتا۔" اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

"کیا پھر میں اسے ٹیوشن پڑھنے کے لیے دوسرے گھروں میں بھیجوں؟"

"مجھے نہیں پتا۔" اس نے کندھے اچکائے۔ اماں کو اس کے لاپروا انداز پر ایک دم سے غصہ آ گیا۔

"کیوں نہیں پتا، کیا تم اس گھر کے فرد نہیں ہو۔ چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھانا تمہارا فرض ہے، کیا فائدہ تمہاری پڑھائی کا جو چھوٹے بہن بھائیوں کے کام

آئے۔ بس کہہ دیا میں نے شام سات سے آٹھ تک حارث اور زرتاج کو ٹیوشن دینی ہے۔ چاہے تو ابھی لے لینا۔"

اماں کا نادر شاہی حکم جاری ہوا اور عزم بھنا کر رہ گیا مگر بہر حال حکم تو ماننا ہی تھا۔

دوسرے دن شام سات بجے زرتاج کے ساتھ ساتھ حارث بھی اوپر اس کے کمرے میں موجود تھا۔ ... وغیرہ ڈال کر اماں نے حارث اور اس کے لیے اوپر کمرہ بنوا دیا تھا، جہاں وہ دونوں سوتے تو تھے ہی، عزم ... کے ساتھ بیٹھ کر پڑھ بھی لیا کرتا تھا۔

عزم واش روم سے باہر آیا تو دیکھا وہ دونوں نہایت ... کے ساتھ کارپٹ پر اپنی کتابیں لیے بیٹھے تھے۔ وہ اماں ہی کیا جو اپنی بات نہ منوالیں، دل ہی دل میں وہ ان سے لڑتے ہوئے ان کے آگے بیٹھ گیا۔

"کاپی دو مجھے اپنی انگلش کی۔" لٹھ مارنے والا انداز تھا۔

زرتاج نے فٹافٹ کاپی اسے پکڑا دی۔ جوں جوں وہ صفحات پلٹتا جا رہا تھا، اس کا خون کھولتا جا رہا تھا۔ اتنی گندی رائٹنگ، لگتا تھا دوسری جماعت کی بچی ہو اور گرامر اور اسپیکنگ کی غلطیاں۔ حارث کا بھی یہی حال تھا۔

"تم لوگ اسکول کیا جھاڑو لگانے جاتے ہو؟" اس نے جل کر پوچھا۔

"کیوں بھائی؟" حارث منمنایا۔

"یہ تمہاری کاپی ہے، اس سے اچھی تو K.G.2 کے بچوں کی کاپی ہو گی۔"

"خوامخواہ ہی، اتنی بھی اندھی نہیں چل رہی۔" حارث بڑبڑایا۔

"تمیز سے بیٹھو، یہ الٹی سیدھی بکواس نہیں چلے گی۔ سنجیدگی سے پڑھنا ہے تو پڑھو، ورنہ چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

حارث اور زرتاج کی مجبوری تھی کہ وہ دل پر جبر کرکے وہیں بیٹھے رہے تھے، ورنہ اس جیسے سڑیل مزاج آدمی سے کون پڑھتا۔ زرتاج اس کے سامنے آ کر بیٹھنے لگی تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے حلیے پر غور کرنے لگا۔ عجیب اول جلول سا حلیہ ہوتا تھا اس کا۔ دوپٹہ پیلا تو قمیص ہری اور شلوار کالی۔ منہ بھی پتا نہیں دھو کر آتی تھی کہ نہیں۔ بال کبھی تو کنگھی کیے ہوتے اور کبھی گھونسلہ سا سر لیے آجاتی اور ذرا کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تو سر کھجانا شروع کر دیتی۔ عزم کو گھن سی آجاتی۔ دس دفعہ اسے ٹوک چکا تھا۔

"حد ہے گندگی کی، اسی وجہ سے وہ اس کے ہاتھ سے کوئی بھی چیز لے کر کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ دماغ میں اتنا بھس بھرا ہوا تھا کہ مشکل سے ہی کوئی بات سمجھ میں آتی۔ ظاہر ہے جس دماغ میں چلبلا پن، فلمیں اور رسالے گھسے ہوں گے، وہاں تعلیم کا یا درسی کتابوں کا کیا گزر۔ ان دونوں کو گرامر سمجھا سمجھا کر عزم کا دماغ تھک جاتا۔ ظاہر ہے جس دماغ میں چلبلا پن، فلمیں اور رسالے گھسے ہوں گے۔ وہاں تعلیم کا یا درسی کتابوں کا کیا گزر۔ ان دونوں کو گرامر سمجھا سمجھا کر عزم کا دماغ تھک جاتا۔ اس دن بھی وہ اسے Tens کا استعمال سمجھا رہا تھا۔ ایک بار، دو بار، تین بار اور چوتھی بار بھی جب اس نے غلطی کی تو مارے طیش کے عزم نے اس کے رخسار پر تھپڑ جڑ دیا اور حسب معمول اس نے بھاڑ سا منہ کھول کر رونا شروع کر دیا۔

"شٹ اپ۔ خاموش رہو۔ منہ بند کرو۔" وہ چیخا۔

حارث منہ کھولے یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

زرتاج نے کاپی اٹھا کر عزم کے منہ پر ماری اور پاؤں پٹختے ہوئے چلی گئی۔ عزم اس کی ہمت پر ہکا بکا رہ گیا جبکہ حارث اس صورت حال سے خوب حظ اٹھا رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا زرتاج کی جرات پر اسے خراج تحسین پیش کرے اور بھنگڑا ڈالے۔

"تم کیا احمقوں کی طرح منہ اٹھائے بیٹھے ہو، مضمون یاد کروانا۔" وہ پلٹ کر اس پر چیخا۔

"کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔" حارث نے دل ہی دل میں کہا۔ بعد میں عزم نے سوچا۔

"چلو اچھا ہی ہوا جان چھوٹ گئی۔ اب وہ پڑھنے تو نہیں آئے گی۔" مگر اس وقت وہ اس کے ڈھیٹ پنے پر

حیران رہ گیا۔ جب دوسرے دن وہ ٹھیک سات بجے اس کے کمرے میں موجود تھی۔

"سوری سر! میں اپنے کل کے رویے پر شرمندہ ہوں۔" اس کے گھورنے پر سر جھکائے جھکائے کہا۔

یوں پڑھانے کو وہ اسے پڑھا دیتا تھا اور وہ تھوڑا بہت تعاون ابھی کرنے لگی تھی مگر اس نے نہ کبھی اس کا رزلٹ پوچھا اور نہ ہی کبھی یہ معلوم کیا کہ میٹرک کے بعد وہ کس کالج میں ایڈمیشن لے گی۔ ان دنوں اتنی مصروفیت ہو گئی تھی کہ ان دونوں کو پڑھانے کے لیے وہ بمشکل ہی وقت نکال پاتا۔ مشکل سے سات آٹھ مہینے ہی اس نے پڑھایا تھا۔ اس کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا تھا جو صرف اپنے بارے میں سوچتے ہیں، کسی اور کے متعلق سوچنے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ وہ تن من دھن سے پڑھائی میں لگا ہوا تھا اور پھر آخر کار وہ ڈاکٹر بن گیا۔ ہاؤس جاب بھی مکمل ہو گئی تو اس نے ابا سے باہر جا کر پڑھنے کی ضد شروع کر دی۔ ابا بے چارے کہاں سے اتنا پیسہ لاتے مگر وہ روز ہی رات کو ابا کی ٹانگیں دباتے ہوئے ایک ہی رٹ لگائے رکھتا۔

"ابا! مجھے امریکہ جا کر اسپیشلائزیشن کرنا ہے۔ مجھے ہارٹ سرجن بننا ہے۔ پلیز ابا! کسی طرح بندوبست کر دیں۔"

یا پھر اماں کے گلے کا ہار بنا رہتا۔ "اماں! کچھ کریں ناں، میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"توبہ کر بچے! ایم بی بی ایس ڈاکٹر بن گیا، بس کافی ہے۔ اب اپنے ابا کا ہاتھ بٹا۔ زندگی اور موت کا کیا سوال ہے؟"

"اماں! آپ نہیں چاہتیں کہ میں معاشرے میں بلند مقام حاصل کروں، اپنے باپ دادا کا نام روشن کروں۔ ایک عام سا ڈاکٹر کیا کر سکتا ہے۔ جاب بھی اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔ پلیز اماں! میں آپ کو بہت اچھے سے بہت سارے زیورات بنا کر دوں گا۔"

"تو تیری نظر میرے زیور پر ہے۔" اماں نے اسے گھورا۔

وہ گڑبڑا سا گیا۔ "یوں رکھے رکھے زیور کسی کام بھی تو نہیں۔ میرا مستقبل بن جائے گا پھر میں۔۔۔"

اچھے وقتوں میں اماں نے خاصا زیور بنایا تھا، بس شوق تھا انہیں زیورات کا۔ تقریباً لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا تو ان کے پاس تھا۔ بیٹے کے اس طرح کہنے پر وہ خفا ضرور ہوئیں مگر پھر بیٹے کی منت سماجت نے انہیں راضی کر ہی لیا۔ کچھ رقم کا بندوبست ابا نے کر دیا تھا اور وہ بڑے جوش و خروش سے امریکہ جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

جب ویزا آنے والا تھا، تب اماں نے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔ اماں کے مطالبے پر وہ حق دق رہ گیا۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ۔" حیرت سے اس کی بڑی بڑی آنکھیں پھٹنے کو ہو گئیں۔

"میں۔۔۔ یعنی ڈاکٹر عزم الحق، زرتاج کے ساتھ۔۔۔ اوہ نو۔۔۔ نیور۔۔۔ اماں یہ سراسر فاؤل ہے، ناممکن سی بات ہے یہ۔ آپ سو جوتے میرے سر پر مار لیں مگر ایسی بات نہ کریں۔ کہاں میں، کہاں زرتاج۔۔۔"

نام لیتے ہوئے اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

"کیوں، کیا فرق ہے تم دونوں میں۔ تم بھی انسان ہو، وہ بھی انسان ہے۔"

"وہ مجھ سے پورے چھ سال چھوٹی ہے اور پھر میں اسے قطعی پسند نہیں کرتا۔ اس کی بچکانہ حرکتیں، چھچھورے انداز۔ نہیں، ہرگز نہیں۔" وہ زور زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم کوئی شہزادے نہیں ہو یا آسمان سے نہیں اترے ہو۔ اللہ نے ایک مرتبہ، ایک مقام دیا ہے تو اس کا شکر ادا کرو، نہ کہ دوسرے بندوں کی توہین کرنے لگو۔ میں اپنا زیور یونہی تو نہیں دوں گی۔ جب تک تم میری بچی کو نہ اپناؤ گے میں تمہیں زیور کی ہوا بھی نہ دوں گی۔"

"آپ کی بچی۔۔۔ اور میں۔۔۔ میں کیا ہوں آپ کا؟" اماں کے الفاظ سے حقیقتاً اسے دھچکا لگا۔

"تم بھی میرے بیٹے ہو مگر نافرمان اور خود غرض بیٹے ہو اور اگر اچھے بیٹے ہو تو حکم مانو ماں کا۔"

"اماں! اور چاہے جو مرضی منوا لیں مگر پلیز۔۔۔" وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

"دیکھو، یہ پلیز ولیز رہنے دو، مجھے ہاں یا ناں میں جواب چاہیے۔ اگر جانا چاہتے ہو تو جانے سے ایک ہفتہ پہلے تمہارا زرتاج سے نکاح ہو گا، ورنہ پھر بیٹھے رہو آرام سے یہیں۔" بڑا حتمی انداز تھا اماں کا۔

اس نے زچ ہو کر اپنا سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔ کس مشکل میں ڈال دیا تھا اماں نے۔ نہ نگلتے بن رہی تھی نہ اگلتے۔

"ضروری تو نہیں ہے کہ نکاح جانے سے پہلے ہی ہو، بعد میں آ کر بھی تو ہو سکتا ہے۔ میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا۔" آخر تھک ہار کر کہا۔

"اور بھاگنا کسے کہتے ہیں۔ نہ بیٹا نہ، میں بھی تمہاری ماں ہوں۔ سب سمجھتی ہوں اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ جو کہہ دوں، پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔ دو چار دن سوچو پھر جواب دینا۔"

"مائی فٹ۔" انتہائی طیش کے عالم میں اس نے میز کے پائے کو لات ماری اور نتیجتاً چوٹ لگنے پر خود ہی کراہنے لگا۔

تیسرے دن ہی اس نے اماں کی رضا پر سر جھکا دیا تھا اور کس دل سے راضی ہوا تھا۔ یہ وہی جانتا تھا جتنی بار اس نے زرتاج کے حوالے سے کوئی اچھا تصور لانا چاہا، اس کے سامنے اس کا اول جلول حلیہ ہی آیا۔ بری طرح سر کھجاتی ہوئی، ہاتھ میں روٹی اور روٹی پر اچار رکھ کر چٹخارے لے لے کر کھاتی ہوئی، گندے کپڑوں، الجھے ہوئے سر کے ساتھ بھاگ دوڑ مچاتی ہوئی۔ بھلا وہ اس قابل تھی کہ ڈاکٹر عزم الحق کی شریک سفر بنے۔

"ناممکن۔ اماں کیا سمجھتی ہیں، کیا میں کسی اعزاز کی طرح اسے اپنے سینے پہ سجا کر رکھوں گا۔ امریکہ پہنچتے ہی طلاق نامہ نہ بھجوایا تو میرا نام بھی عزم الحق نہیں۔" زرتاج فی الحال منظر سے غائب ہو چکی تھی۔ اسے نظر کہیں نہیں آتی تھی، ورنہ اسی سے لڑ جھگڑ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا۔ پتا نہیں فساد کی جڑ کہاں گئی ہوئی تھی۔

اس کی رضامندی کے بعد ہی نکاح کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ دو چار قریبی عزیزوں میں دعوت نامے تقسیم کیے گئے، کچھ تھوڑی بہت شاپنگ کی گئی، تھوڑا سا ہلا گلا کیا گیا اور ادھر اس کا ویزا آیا، ادھر اس کا نکاح زرتاج سے ہو گیا۔ زندہ دل اور خوش مزاج تو وہ پہلے بھی نہیں تھا مگر ان دو تین ہفتوں میں تو عجیب کھٹمنا سا بن گیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ سارے ہی بہن بھائی سہم سے گئے تھے پھر بھی اس خوشی کے موقع پر بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ جب تک عزم گھر میں نہ ہوتا، بہنیں ڈھولک بجاتیں، گانے گاتیں۔ حارث اور فرمان ڈانس کرتے مگر عزم کے گھر میں داخل ہوتے ہی ہر طرف خاموشی چھا جاتی۔ چند عزیزوں کی موجودگی میں نکاح ہوا۔ دونوں کو برابر میں بھی بٹھایا گیا۔ عزم نے اماں کے کہنے پر نئے کپڑے بھی پہنے تھے مگر منہ اس کا غبارے کی طرح پھولا ہوا تھا۔ زرتاج کو پوری طرح دلہن بنایا گیا تھا۔ عزم اپنی کھولن پر ہی قابو نہ کر پا رہا تھا اسے کیا دکھتا کہ وہ کیسی لگ رہی تھی۔ خدا خدا کر کے تقریب ختم ہوئی اور وہ رسہ تڑا کر بھاگا۔ تھکے تھکے شکست خوردہ انداز میں سیڑھیاں چڑھ کر وہ اپنے کمرے تک آیا۔ پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا اور اندر کا منظر دیکھ کر کسی بم کی طرح بلاسٹ ہو گیا۔

"اوہ یو۔۔۔" غراتے ہوئے وہ انگلیاں چٹخاتی، گھبرائی، شرمائی سی زرتاج کے سر پر جا پہنچا۔ "تم۔۔۔ یہاں کیسے آئیں، تمہیں جرات کیسے ہوئی۔ نکلو، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ خبردار جو میرے کمرے میں قدم رکھا۔" وہ کف اڑا رہا تھا۔

بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے قتل کر دے۔ اس کے سجے سجائے سندر روپ پر اس کی نظر ہی نہ گئی۔ احساس شکست نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے دروازے تک لایا اور باہر کی طرف دھکیل کر زور سے دروازہ بند کر لیا۔ اس درجہ ذلت اور توہین پر زرتاج کے اندر آہوں اور

چیخوں کا طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے منہ پر ہاتھ جما کر اپنی چیخوں کو بمشکل دبایا۔ صحن میں لگے ہوئے نلکے سے کتنی دیر تک منہ دھوتی رہی مگر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ یہ سب حارث اور ردا کی کارستانی تھی، ان دونوں نے ہی اسے اس کے کمرے میں پہنچایا تھا کہ جس کے لیے اس نے یہ روپ سجایا تھا، وہ تو دل بھر کر اس کا یہ روپ دیکھ لے پھر تو اس نے کئی سالوں کے لیے دور دیس چلے جانا تھا۔ زرتاج تو بالکل بھی راضی نہیں تھی مگر وہ دونوں کسی نہ کسی طرح اسے بہلا پھسلا کر لے ہی آئے تھے۔ اس کی تو پہلے ہی سٹی گم تھی اور وہ... ظالم، سنگدل انسان جس کے سینے میں دل نہیں پتھر تھا۔ تولیے سے منہ خشک کرنے کے بعد وہ بوجھل قدموں کے ساتھ نیچے اتر آئی تھی جہاں حارث، ردا اور ثوبیہ ڈھیروں سوالات نوک زبان پر روکے بیٹھے تھے مگر اس کی سوجی ہوئی آنکھیں اور اترا ہوا چہرا دیکھ کر وہ چپ کے چپ رہ گئے۔

اس کے جانے میں دو چار دن ہی رہ گئے تھے اور وہ اپنی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ زرتاج کو تو وہ نگاہ اٹھا کر دیکھنا تک گوارہ نہ کرتا۔ صبح جب وہ ناشتے کے انتظار میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا، تب عین اس کی ناک کے نیچے چوڑیاں کھنک اٹھیں، وہ چونک سا گیا۔ مہندی اور چوڑیوں سے مزین ہاتھ اس کے ناشتے کی ٹرے رکھ رہے تھے۔ اس کی نگاہ اس کے ہاتھوں سے ہوتے ہوئے صرف گردن تک ہی گئی تھی۔

"اماں! اماں..." وہ برہم سا ہو کر چیخا۔ "مجھے آپ کے ہاتھ کا ناشتہ چاہیے۔"

"ناشتہ میں نے ہی بنایا ہے۔" اماں نے کچن سے ہی جواب دیا۔ ناشتہ رکھ کر زرتاج دبے قدموں جا چکی تھی۔

"صبح ہی صبح موڈ خراب کر دیا ہونہہ..." اس نے بے دلی سے ناشتے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

"جا بیٹا... جا شاباش... تھوڑی اس کی مدد کروا دے، اس کو کہاں یہ سب کرنا آتا ہے، پیکنگ کر دے اور ہاں... دیکھ کسی پرچی پر کوئی اچھی سی بات لکھ کر اس کے کپڑوں کی تہوں میں چھپا دینا، سمجھتی ہے نا۔" اماں بڑے پیار سے اسے پچکار رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری جا رہی تھیں۔

"اماں! میں نہیں جاتی، کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں وہ... مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں، شروع شروع کی بات ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جا اس کی چیزیں اور کپڑے بیگ میں رکھ دے۔"

"اماں..." اس نے بے بسی سے ہاتھ مسلے۔ عجیب مشکل میں جان پھنس گئی تھی۔ وہ اس کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا ہتک آمیز رویہ اسے آٹھ آٹھ آنسو رونے پر مجبور کر دیتا تھا اور اماں بضد تھیں کہ وہ اس کے پاس جائے، "مجبوراً" وہ اس کے کمرے تک آئی۔ دروازے پر دستک دی تو حارث نے اسے اندر آنے کو کہا۔ عزم کمرے میں موجود نہیں تھا۔ واش روم کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا، وہ شاید شیو بنا رہا تھا۔ اس کی الماری کھلی ہوئی تھی اور اٹیچی بھی جس میں ایک دو جوڑے رکھے تھے۔ باقی کے سارے ابھی کپڑے وارڈروب میں ہی ہینگ کیے ہوئے تھے۔

زرتاج اندر آ گئی تو حارث جو کہ ٹی وی دیکھ رہا تھا معنی خیز انداز میں دیدے گھماتے ہوئے ٹی وی بند کر کے خاموشی سے رفو چکر ہو گیا۔ جبکہ زرتاج نے ڈرتے ڈرتے جیسے ہی الماری میں سے کپڑوں کے ہینگر نکالے، عزم واش روم سے برآمد ہو کر کسی چیل کی طرح اس پر جھپٹا اور کپڑے اس سے چھین کر بیڈ پر پھینک دیے۔

"زیادہ ہیروئن بننے کی ضرورت نہیں ہے، میں خود رکھ لوں گا اپنے کپڑے۔ کیا سمجھتی ہو تم، اس طرح مجھے اپنے دام میں پھنسا لوگی۔ مائی فٹ... آئی ہیٹ یو۔ میں مر جاؤں گا مگر تمہارا ساتھ کبھی قبول نہیں کروں گا۔ نفرت ہے مجھے تمہارے بے ڈھنگے وجود سے اور مت سمجھنا کہ ساری عمر تمہیں طوق بنا کر اپنے گلے میں لٹکا کر رکھوں گا۔ بہت جلد وہاں پہنچتے ہی تمہیں آزادی کا پروانہ روانہ کر دوں گا، تمہاری کسی ہمدردی کی

امداد کی مجھے قطعی ضرورت نہیں ہے۔ جاؤ نکلو میرے کمرے سے اور آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا۔"

ذلت سے زرتاج کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ضبط کرتے کرتے اس نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے کچل ڈالے اور اماں کے سامنے آ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"اماں! آپ نے میرے ساتھ یہ ظلم کیوں کیا، جب میں ان کے قابل نہیں تھی تو کیوں باندھا آپ نے یہ بندھن اور مجھے بار بار ان کے پاس ذلیل کروانے کے لیے کیوں بھیجتی ہیں۔ میں مر جاؤں گی مگر اب ان کے سامنے نہیں جاؤں گی۔ ان کے سینے میں دل نہیں، پتھر ہے اور پتھر سے سر ٹکرانے کا کیا فائدہ، انہیں اپنی ذات کے علاوہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔"

یہ سب سن کر اماں بھی چپکی ہو رہیں پھر ثوبیہ اور ردا نے اس کی تیاری مکمل کی اور صبح چھ بجے کی فلائٹ سے وہ امریکہ روانہ ہو گیا۔ گھر کے سب لوگ، اس کے احباب اور دوست اسے ایئرپورٹ چھوڑنے آ گئے تھے مگر زرتاج نہیں گئی اور اس کی کمی کو عزم نے بالکل بھی محسوس نہیں کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

چار پانچ مہینے تک اسے وہاں ایڈجسٹ ہونے میں پریشانی ہوئی۔ رہائش کا یوں مسئلہ نہیں تھا کہ اس کے دوست کا بھائی ڈاکٹر فہد ایک سال پیشتر امریکہ آیا تھا۔ عزم اسی کے اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر تھا۔ ڈاکٹر فہد کھلا سا زندہ دل اور جولی انسان تھا۔ عزم جیسے خشک بندے کی خشکی بھی اس نے بہت تھوڑے عرصے میں بھگا دی تھی۔ عزم نے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ چھوٹی موٹی جاب بھی حاصل کر لی۔ شروع میں اسے ٹیکسی بھی چلانا پڑی۔ پیٹرول پمپ پر بھی ملازم ہوا۔ اخبار بھی تقسیم کیے۔ وہ صرف چار گھنٹے جاب کرتا تھا، باقی اس کے پاس صرف پڑھائی کے لیے وقت ہوتا تھا۔ پانچویں مہینے میں اسے ایک اسٹور میں ملازمت مل گئی۔ زیادہ دوستیاں کرنے کی نہ اسے پہلے عادت تھی اور نہ ہی اب اس نے کسی کو دوست بنایا تھا۔ صنف نازک سے بھی اسے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ بس پڑھنا، پڑھنا اور پڑھنا۔ یہی تھا اس کا نصب العین۔ باقی ڈاکٹر فہد اس کا خاص طور پر خیال رکھتا۔ اس کی ہر وقت اخلاقی اور مالی مدد کے لیے تیار رہتا۔ اس کی پڑھائی میں اس کی مدد کرتا۔

امریکہ آنے کے کچھ عرصے بعد جب وہ سیٹ ہو گیا تو اس نے سوچا کہ زرتاج کو طلاق کے کاغذات بھجوا دے۔ خوامخواہ دم چھلا لٹکائے رکھنے کا کیا فائدہ۔ کاغذات کی تیاری میں اس نے کچھ کارروائی بھی کر لی تھی مگر پھر اسے خیال آیا کہ اس اچانک کارروائی سے اماں کو کچھ نہ ہو جائے۔ وہ پہلے ہی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں۔ اگر خدانخواستہ انہیں ہارٹ اٹیک وغیرہ ہو گیا تو... بس یہی سوچ کر اس نے اس کارروائی کو اپنے پاکستان واپس جانے پر موقوف کر دیا۔

گھر سے فون بھی آتے تھے، خط بھی لکھے جاتے مگر کبھی بھی گھر کے کسی فرد نے زرتاج کا ذکر نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اماں بھی جو ہر وقت زرتاج زرتاج کے گیت گاتی رہتی تھیں، وہ بھی اس معاملے میں چپ تھیں۔

عزم کو تو اس سے رتی برابر بھی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے کبھی جاننے کی کوشش بھی نہ کی۔ ہاں باقی گھر کے ہر فرد کی خیریت معلوم کرتا۔ ردا، ثوبیہ، حارث، فرحان، اماں ابا سب سے "فرداً فرداً" گفتگو کرتا ان کے معمولات پوچھتا، انہیں آگے مزید آگے بڑھنے کی نصیحتیں کرتا۔ اسے امریکہ آئے ہوئے دوسرا سال تھا، اس عرصے میں حارث بی ایس سی کر چکا تھا۔ ردا اور ثوبیہ انٹر میں تھیں اور فرحان میٹرک کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ابا بیمار ہو گئے تھے۔ دکان پر زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتے تھے، اس لیے حارث کو مجبور کرتے تھے کہ وہ دکان پر بیٹھے جبکہ حارث ملازمت کرنا چاہتا تھا جو اسے مل کر نہیں دے رہی تھی۔ کئی بار اس نے عزم سے فرمائش کی تھی کہ وہ اسے امریکہ بلوا لے مگر عزم ہر بار ہنس کر ٹال دیتا۔ اس نے پہلے ایک بڑی رقم جمع کر کے ابا کو بھیجی جس میں اماں کے زیورات کے پیسے بھی تھے اور پھر وہ ہر ماہ تھوڑی بہت بچت کر کے پاکستان بھیجنے لگا، یوں

راوی چین ہی چین لکھتا گیا۔

چوتھے سال اسے ایک بڑے اسپتال میں جاب بھی مل گئی، فہد بھی اسی اسپتال میں تھا۔ اچھی انکم ہونے لگی تو اس نے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا حق سمجھتے ہوئے انہیں اچھے خاصے پیسے بھیجنا شروع کردیے اور دو سال کے عرصے میں اس نے اتنا کچھ بھیج دیا تھا کہ ابا نے گھر کو نئے سرے سے تعمیر کر کے تین منزلہ بنا لیا تھا۔ حارث ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کرنے لگا تھا اور ثوبیہ اور ردا کے رشتے طے ہو گئے تھے۔ اس کے پاکستان آنے پر شادی ہونا تھی مگر فی الحال اس کا پاکستان جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اماں ہمیشہ اس سے واپس آنے کا کہتیں اور وہ صرف ہوں ہاں کر کے رہ جاتا اور اماں دکھی ہو جاتیں۔

"پتا نہیں تیرے ماں باپ کب تک زندہ رہیں۔ کیا تو انہیں اپنی شکل بھی نہیں دکھائے گا۔"

"آؤں گا اماں! جلد آؤں گا۔"

اس طویل عرصے میں ڈاکٹر فہد سے اس کی اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ جب وہ دونوں فرصت کے لمحات میں مل بیٹھتے تو فہد اپنی خوش مزاجی کے باعث کئی ایسی باتیں کر جاتا جس پر عزم جیسا خشک اور روکھا بندہ بھی قہقہہ لگانے پر مجبور ہو جاتا۔ ویسے بھی اب جبکہ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہو چکا تھا تو اس کی ذات پر جو سنجیدگی کا خول چڑھا ہوا تھا وہ چٹخنا شروع ہو گیا۔ اب دنیا اور دنیا کی رنگینیوں کو محسوس کرنے کی اس کی حس پورے طور پر تو نہیں، مگر کچھ کچھ بیدار ہو چکی تھی۔ اس کی جاب کو تیسرا سال تھا اور وہ ہارٹ سرجن بن چکا تھا جب ایک دن فہد نے اس سے کہا تھا۔

"یار! کیا واپس اپنے دیس نہیں جانا؟"

"جانا ہے، کیوں نہیں جانا۔"

"مگر کب۔ یار! کیا ایسا نہیں لگتا کہ ہم پیسہ کمانے کی مشین بن گئے ہوں۔ اپنے گھر والوں سے، عزیزوں سے دور بیگار کاٹ رہے ہوں اور پھر ہم میں اتنا ٹیلنٹ ہے، اپنے شعبے میں مخلص ہیں تو پھر کیوں ہم یہ کارکردگی اور خلوص دوسرے لوگوں پر ضائع کر رہے ہیں۔ کیا ہمارے ٹیلنٹ کی ہمارے علاج کی ضرورت ہمارے ملک کو ہمارے لوگوں کو نہیں۔ بڑا ظلم ہے یار یہ تو۔ کل میں سوچ رہا تھا۔ ہم پیدا پاکستان میں ہوئے، ہماری پرورش پاکستان میں ہوئی، ہمیں نام اور مرتبہ پاکستان نے دیا اور ہم فائدہ غیر ملکیوں کو پہنچا رہے ہیں۔ ہمارے اپنے لوگ علاج سے محروم ہیں، وہاں تو پہلے ہی ڈاکٹرز کی کمی ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہو کہ ہم اپنے ملک میں جا کر اسپتال کھولیں، غریبوں کا علاج مفت کریں۔ سب کچھ دولت ہی تو نہیں ہوتی۔ انسان کچھ اپنی آخرت بھی تو سنوارے۔ بس یار! میں نے تو سوچ لیا ہے کہ میں اب پاکستان جاؤں گا اپنے لوگوں کے پاس، اپنے وطن میں، اپنی سرزمین پر۔ بہت دولت حاصل کر لی میں نے، کافی ہے میرے لیے یہ سب۔ اب میرے وطن کو میری ضرورت ہے۔"

جذبوں کی حدت سے اس کا چہرہ سرخ چمک رہا تھا اور عزم پوری آنکھیں کھولے اس جذباتی بندے کو دیکھ رہا تھا جو لمحوں میں فیصلہ کرتا تھا اور اپنے فیصلوں پر عملدرآمد کرنے میں دیر بھی نہیں لگاتا تھا۔

مستقل رہنے کے ارادے سے تو وہ بھی امریکہ نہیں آیا تھا مگر ابھی دو چار سال مزید وہاں رکنا چاہتا تھا مگر فہد کی جذباتی تقریروں نے آخر کار کام کر دکھایا اور وہ دونوں آخر کار اپنے وطن لوٹ آئے۔

☼ ☼ ☼

وہ ہارٹ سرجن تھا۔ ایک کامیاب ڈاکٹر اس کے خاندان کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں تھا۔ اس کے آنے پر کئی دیگیں چڑھائی گئیں۔

سارے خاندان والے جمع تھے اور وہ بڑے فخر سے سر اٹھائے بیٹھا تھا۔ اماں اس کی بلائیں لیتے نہ تھکتی تھیں۔ بہنیں صدقے واری جا رہی تھیں۔ حارث اور فرحان اس کے ساتھ چپک کر بیٹھے ہوئے تھے اور ابا کا چہرہ بیٹے کی کامیابی پر جگر جگر کر رہا تھا۔ بہت سارے دن ایسے ہی دعائیں اور مبارک بادیں سمیٹتے گزر گئے۔ [illegible]

کو اور اسے پرائیویٹ اسپتال سے آفر آئی تھی مگر ڈاکٹر فہد نے کہا۔ ہم خدمت خلق کا جذبہ لے کر اپنے وطن واپس آئے ہیں۔ ہم دونوں گورنمنٹ اسپتال میں ملازمت کریں گے۔ سو اس نے اور فہد نے گورنمنٹ اسپتال میں ملازمت کر لی۔ اس دوران عزم کو اندازہ ہوا کہ پاکستانی عوام کس طرح ویلفیئر کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں، کس طرح رات کے اندھیروں میں لاکھوں روپے دواؤں اور غریبوں کے علاج کے لیے دے کر جاتے ہیں اور اپنا نام تک بتانا پسند نہیں کرتے۔ اگر اسپتال کا عملہ دیانتداری سے ان رقوم کا استعمال کرے تو پاکستان میں کوئی آدمی علاج معالجے سے محروم نہ رہے اور بعض ڈاکٹرز بھی اتنے پرخلوص اور اچھے تھے کہ ان کے جذبے کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ جیسے کہ ڈاکٹر عثمان جو کہ ایک باریش ڈاکٹر تھے۔ عزم تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس پروفیشن سے منسلک انسان اتنا درویش صفت بھی ہو سکتا ہے۔ عجز و انکساری کا ایسا پیکر بھی ہو سکتا ہے۔

یہ عزم کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ہمیشہ ایسی صحبت ملی جس نے اس کے اندر انسانیت کو زندہ کر دیا، اس کے اندر کے تکبر اور غرور کو آہستہ آہستہ ختم کرنا شروع کر دیا۔ ان کے سمجھانے کا انداز اتنا موثر تھا کہ انسان کا دل خود بخود ان کی طرف کھنچتا تھا۔

"آپ کتنی بھی ترقی کر لیں، کوئی بھی منصب حاصل کر لیں، آپ اللہ تعالیٰ کے بندے ہی رہیں گے، خدا نہیں بن جائیں گے۔ بندے اور اللہ تعالیٰ کا تعلق کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اول و آخر ہم اللہ کے بندے ہیں اور بندے کا کام ہے عجز و انکساری کرنا اور عجز کی انتہائی حالت سجدہ ہے۔ بندے کی کمتر ترین حالت سجدہ کہ ماتھا بھی خاک پر ہے ناک بھی اور زبان پر ہے سبحان ربی الاعلیٰ۔ یعنی اعلا ہے اللہ کی ذات۔ بظاہر کمتر ترین پوزیشن مگر غور سے دیکھا اور سمجھا جائے تو یہی سجدہ ہمیں بندگی کے اعلا منصب پر پہنچا دیتا ہے۔ تو میرے بچو! نماز پڑھا کرو باقاعدگی کے ساتھ، نماز فرض عبادت ہے۔ اللہ کا قرب حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ۔"

عزم ڈاکٹر عثمان کو آئیڈیلائز کرنے لگا تھا، چنانچہ وہ ان کے جیسی خوبیاں اپنے اندر بھی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نماز کی پابندی کی کوششیں شروع کر دیں۔ صبح فجر کی نماز کے لیے جب وہ اٹھتا تو نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ ٹیرس پر آ کر کھڑا ہو جاتا۔ مشرق سے ابھرتا ہوا نارنجی گولا، چڑیوں کا چہچہانا، آسمان کی وسعتوں میں پھیلتی ہوئی نارنجی کرنیں اس کے اندر گداز سا پیدا کر دیتیں۔ وہ مبہوت سا ہو کر منظر دیکھتا رہتا۔ اس سے پہلے کبھی بھی اس نے مناظر کی اس خوبصورتی کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

ان دنوں ان کے اسپتال میں میڈیکل کالج سے فارغ ہونے والی لڑکیاں ہاؤس جاب کے لیے آ رہی تھیں۔ وہ ڈاکٹر فہد کے ساتھ راہداری سے گزر رہا تھا، جب ڈاکٹر فہد اس کے کان کے پاس منہ لا کر گنگنایا تھا۔

حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں
ان کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں

عزم نے اسے گھور کر دیکھا، فہد نے آنکھ سے سامنے اشارہ کیا اور سامنے کاؤنٹر پر کھڑی ڈاکٹر کو دیکھ کر عزم ایک دم ہی چونک سا گیا۔

"یہ تو شاید... نہیں مگر۔" اسے شک سا ہوا۔ وہ خوبصورت، دراز قد نازک سی لڑکی جس کے لائٹ براؤن بالوں کی لمبی اور گھنی چوٹی اس کی کمر تک جھول رہی تھی۔ وہ زرتاج تو نہیں ہو سکتی تھی۔ بھلا وہ کوڑھ مغز سی لڑکی ڈاکٹر کیسے بن سکتی ہے اور اگر ایسا ہوتا تو اماں تو ضرور ذکر کرتیں۔ یقیناً یہ کوئی اور ہی ہے۔ اس پر نظریں جمائے جمائے عزم نے سوچا۔ سفید اوور آل پہنے وہ اپنی ساتھی ڈاکٹر سے محو گفتگو تھی۔ ان دونوں کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے فوراً سے پیشتر بڑے سے سفید دوپٹے سے سر ڈھک لیا۔ اس کی محویت کو محسوس کر کے فہد نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

"یار واپس آجاؤ، ویسے ہے ناں اے ون۔"

"فہد! اپنا پروفیشن دیکھو اور یہ چھچھوری حرکتیں۔" عزم نے اسے شرم دلانا چاہی۔

"کیا پروفیشن۔ ڈاکٹر ہوں تو کیا ہوا' کیا دل نہیں ہے میرے پاس۔ حس لطیف تو رکھتا ہوں۔ اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کی تعریف تو کر سکتا ہوں۔" وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ قریب سے گزرنے پر دونوں نے مشترکہ سلام کیا اور ہوا کے نرم جھونکے کی طرح سے ان کے پاس سے گزر گئیں۔

"حق۔۔۔ ہا۔۔۔" فہد نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "خوامخواہ ہی اتنے سال فرنگنوں کے ملک میں ضائع کیے۔"

"زیادہ ہی اوور نہیں ہو رہے ہو۔" اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے عزم بولا۔

"ویسے یار! یہ تو مذاق تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم نے اتنے سال اپنا کیریئر بنانے میں صرف کر دیے' اب اپنی زندگی پر بھی توجہ دینا چاہیے۔ تمہارا شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں تو سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ کوئی بھلی سی لڑکی دیکھ کر شادی کر لوں۔" وہ اس وقت اسپتال کی عمارت سے باہر نکل آئے تھے اور لان میں اگی ہوئی نرم گھاس پر چل رہے تھے۔ فہد کے توجہ دلانے پر اس کے اندر بھی ایک خوبصورت اور من چاہے ساتھی کی تمنا جاگ اٹھی۔

تب اسے یاد آیا کہ سات سال پہلے اس کا نکاح زرتاج سے ہوا تھا' وہ زرتاج جو اس کی چڑ تھی۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اس کا فیصلہ بھی ایک دن کرنا تھا' اس کے لیے وہ کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔ فی الحال تو وہ اسے گھر میں کہیں بھی نظر نہیں آئی تھی یا تو وہ اپنے والد کے پاس جا چکی تھی یا پھر اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی کہیں چھپ جاتی تھی اور اسے دیکھنے کی' کھوجنے کی اسے خواہش بھی نہیں تھی۔

زبردست شاک تو اسے اس وقت لگا تھا جب ڈاکٹر رضوی نے اسی لڑکی کو ڈاکٹر زرتاج کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ "تو۔۔۔ کیا واقعی یہ وہی زرتاج تھی' وہ بے ڈھنگے حلیے والی' منہ پھاڑ کر رونے والی' روٹی کے اوپر اچار رکھ کر کھانے والی زرتاج۔ ڈاکٹر زرتاج۔۔۔" آج اس کے سامنے ڈاکٹر زرتاج کی شکل میں اجلے شفاف سفید لباس میں اور اس کے ہاتھ' انتہائی نفاست سے ترشے ہوئے ناخن سفید مومی ہاتھ جو اس کی فائل پر دھرے تھے اور وہ اس کا گھونسلہ سا سر۔ اب اجلی شفاف مانگ' گھٹنوں تک پہنچتی لائٹ براؤن بالوں کی چوٹی اور لائٹ براؤن ذہانت سے چمکتی ہوئی روشن آنکھیں۔

کتنی ہی دیر تک وہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رہا تھا اور پھر سب سے بڑی بات زرتاج کا رویہ' وہ تو بالکل انجان بنی ہوئی تھی۔ شناسائی کی کوئی ہلکی سی رمق بھی اس کی آنکھوں میں نہیں تھی۔ اسپتال میں روز ہی سامنا ہو جاتا مگر اس کے رویے سے کبھی بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ اس کا کزن ہے' وہ دونوں کسی اجنبی کی طرح ایک دوسرے کے سامنے آتے تھے' سینئر ہونے کی وجہ سے وہ اس کی عزت کرتی تھی۔

عزت تو وہ فہد کی بھی کرتی تھی مگر فہد تھا کہ اس پر لٹو ہوئے جا رہا تھا۔ عزم کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس پر غصہ آ جاتا۔ غصہ تو اسے زرتاج پر بھی بے طرح آتا جو ماش کے آٹے کی طرح اینٹھ گئی تھی۔ اس کے لیے تو باعث فخر تھی یہ بات کہ وہ عزم کی کزن تھی اور نہ صرف کزن بلکہ منکوحہ بھی۔ بے نیازی کی حد تھی کہ اس نے اپنے کسی ساتھی کو بھی نہیں بتایا کہ عزم سے اس کا کتنا قریبی رشتہ ہے پھر وہ خود کیوں اسے متعارف کرائے' وہ کوئی اس سے جان پہچان کرنے کے لیے مرا تھوڑی جا رہا تھا۔ ہاں اماں سے اس نے شکوہ ضرور کیا۔

"اماں! آپ نے اپنی بھانجی کے بارے میں مجھے کبھی بتایا ہی نہیں۔"

"کیا۔۔۔ کیا نہیں بتایا؟" سبزی بناتے ہاتھ لمحہ بھر کو رک گئے۔

"یہی کہ وہ میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے اور ڈاکٹر بن گئی ہے۔"

"تم نے کبھی پوچھا؟ تمہیں اس کی ذات سے دلچسپی ہی کیا تھی' وہ کچھ بھی کرتی پھرے۔"

"مگر اماں! وہ تو اتنی کند ذہن اور ڈل ہوتی تھی پھر۔۔۔"

"نہ بچے! وہ کند ذہن نہیں تھی۔ بچپن سے ہی بہت ذہین تھی۔ بس توجہ نہیں دیتی تھی پھر تیرے الفاظ' تیرا رویہ اس کے لیے چیلنج بن گیا۔ تو یہیں تو تھا' جب اس نے فرسٹ ایئر میں بہت اچھے نمبر لیے تھے مگر تجھے خبر نہ ہوئی۔ تو پوچھتا تھا نا کہ میں اس کا سب سے زیادہ خیال کیوں رکھتی ہوں تو بیٹا! ہر اچھے عمل کا صلہ ایک دن سامنے ضرور آتا ہے' میں تم لوگوں کی بہتری کے لیے اسے اولیت دیتی تھی۔ مجھے پتا تھا' میرا رب میری نیکی کا صلہ میری اولاد کو ضرور دے گا اور دیکھ لو تم لوگ' کیسا پھل پھول رہے ہو۔ بیٹا! اللہ تعالیٰ چاہے چھوٹے چھوٹے گناہوں کو در گزر کر بھی دے مگر چھوٹی سے چھوٹی نیکی کو بھی رائیگاں نہیں کرتا۔ کبھی نہ کبھی اس کا پھل مل ہی جاتا ہے۔ میرے سارے بچے جو اتنے نیک اور فرمانبردار ہیں' برائیوں سے بچے ہوئے ہیں اور میری بچیوں کو جو اتنے اچھے رشتے مل گئے ہیں' یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ ہاں بس ایک غلطی ہو گئی مجھ سے۔ شادی تو دو دلوں کے راضی بہ رضا ہونے کا نام ہے' میں نے تمہارے ساتھ زبردستی کی' تمہارے سر اسے تھوپنے کی کوشش کی' صرف اس وجہ سے کہ مجھے تمہارا مستقبل روشن نظر آتا تھا اور میں اس کے لیے تمہارے جیسا ہی ساتھی چاہتی تھی' زری نے وہ ساری باتیں بتا دی تھیں جو تم نے اس سے کہیں۔ تو بیٹا! مجھے اس چیز کے لیے معاف کر دینا' تم جہاں چاہو گے تمہاری شادی وہیں ہو گی اور تم جب چاہو زرتاج کو اس بندھن سے آزاد کر دو۔"

آخر میں اماں کے لہجے میں دکھ سا اتر آیا اور وہ خود بھی کچھ مضطرب سا ہو گیا تھا اور اپنا یہ اضطراب خود اسے بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو خود دل سے چاہتا تھا کہ جلد سے جلد زرتاج کو طلاق دے کر اپنے گلے سے یہ طوق اتار پھینکے مگر کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ دوسری طرف ڈاکٹر فہد کی دلچسپی دن بدن زرتاج میں بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔

عزم کا کوفت کے مارے برا حال تھا۔ اب تو فہد' زرتاج سے ہلکی پھلکی گفتگو بھی کر لیتا تھا۔ وہ زرتاج سے اپنا تعلق ظاہر کرنا چاہتا تھا مگر اس کی "میں" اسے ایسا کرنے نہیں دیتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور پھر آخر کار ایک دن ڈاکٹر عثمان کی بصیرت افروز تقریر نے اس کی اس "میں" کا بھی خاتمہ کر دیا۔

ان دنوں ایک خاتون بائی پاس کے لیے اسپتال میں ایڈمٹ تھیں۔ آپریشن کے بعد بھی وہ خاتون ہوش میں نہیں آئیں' خاصی تشویش ناک صورت حال تھی۔ ڈاکٹر عثمان پوری رات اللہ کی عبادت کرتے رہے اور اس خاتون کے ہوش میں آنے کی دعائیں مانگتے رہے اور صبح تقریباً چھ بجے خاتون کو ہوش آ گیا۔ ڈاکٹر عثمان نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ اسی خوشی میں دوسرے دن انہوں نے تمام اسٹاف کو ایک چھوٹی سی پارٹی دی تھی' فرشی نشست پر وہ تمام لوگ اسنیکس اور کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہلکی پھلکی گفتگو بھی کر رہے تھے۔ ڈاکٹر عثمان بتا رہے تھے۔

"ایک زمانہ تھا کہ مجھے اپنے آپ پر بڑا گھمنڈ' بڑا ناز تھا۔ میرا ہر آپریشن کامیاب ہوتا تھا' میرے اندر "میں' میں" کی گردان شروع ہو گئی۔ تکبر کا نشہ پورے طور پر مجھ پر حاوی تھا۔ بس پھر کیا تھا' اللہ تعالیٰ کو مجھے ہدایت دینا تھی کہ ایک بالکل معمولی سا کیس' ایسا شخص جس کو ہارٹ اٹیک بھی نہیں ہوا تھا' اس کا میں نے آپریشن کیا اور وہ بندہ پتا نہیں کیسے ختم ہو گیا۔ یہ پہلا دھچکہ تھا پھر اس کے بعد دوبارہ پھر ایسا ہی ہوا۔ میری ساکھ کو نہ صرف نقصان پہنچا بلکہ لوگ مجھے الزام دینے لگے کہ میں جان بوجھ کر اپنی لاپروائی سے ایک نارمل آپریشن بھی صحیح نہیں کر پاتا۔ تب میں نے خود اپنا محاسبہ کیا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ "میں" کچھ نہیں ہوتی' بس "تو ہی تو" اصل چیز ہے۔ ہمارا وجود کسی قابل نہیں جب تک وہ "ذات" مہربان نہ ہو' کرنے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اللہ اگر نہ چاہے تو ہم ایک انچ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتے۔ اس کے بعد میں نے پوری رات جاگ کر اللہ تعالیٰ کی

عبادت کی' اپنے گناہوں کی' غفلت کی معافیاں مانگیں' رویا' گڑگڑایا اور میرے اللہ نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ ایک انتہائی سیریس آپریشن اللہ کے حکم سے کامیاب ہو گیا اور اب جب بھی مجھے کوئی مشکل پیش آتی ہے میں اپنے اللہ سے رجوع کرتا ہوں۔ وہ سب سے بڑا کارساز اور مددگار ہے۔ پتا ہے جسے اللہ مل جائے وہ دنیا کا خوش قسمت ترین انسان بن جاتا ہے۔

بعض خوش نصیب ہوتے ہیں ایسے کہ جن پر اللہ تعالیٰ خود ہی مہربان ہو جاتا ہے مگر زیادہ تر لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں اللہ کو پانے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے' اپنا آپ مارنا پڑتا ہے' اپنے نفس پر کوڑے برسانے پڑتے ہیں۔ جب تمہارے مدمقابل کوئی ایسا ہو کہ تم اسے پسپا کر سکتے ہو اور اسے نیچا دکھانے کے لیے تمہارا دل بے چین ہو رہا ہو' مدمقابل تمہیں گالیاں دے رہا ہو۔ حتیٰ کہ تمہارے منہ پر تھوک بھی دے اور تمہارا دل چاہے کہ تم اس کا گلا دبا دو' چیر پھاڑ کر رکھ دو' ایسے میں اگر تم اسے صرف "اللہ" کے لیے معاف کر دو اور نہ صرف معاف کر دو بلکہ خود اس سے معذرت کر لو کہ شاید قصور میرا ہی تھا۔ ایسا کہتے ہوئے تمہارا دل خون ہو جائے گا اور یہ دل کا خون ہو جانا ہی قربت الٰہی کی نشانی ہے۔ کبھی ایسا مرحلہ آئے تو اللہ سے مانگ کر دیکھنا' کیسا نوازتا ہے ایسے وقت میں اللہ تعالیٰ..... تو میرے بچو! اپنے اندر سے "میں" کا خاتمہ بے حد ضروری ہے۔ ہم لوگ صرف محنت کرتے ہیں' صلہ تو اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ ہر وقت' ہر پل ہمیں اس کا شکر گزار رہنا چاہیے۔ اس کا شکر ادا کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہمارے سر پر آسمان اور پیروں تلے زمین ہے۔"

وہ سب ہی دم سادھے ڈاکٹر عثمان کی بصیرت افروز باتیں سن رہے تھے۔ ان کا لہجہ اتنا گداز تھا کہ کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ خود عزم نے اپنا احتساب کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے اندر تو "میں" کی گردان کافی عرصے سے اور زور و شور سے جاری تھی۔ اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہتا تو کیا وہ ڈاکٹر بن سکتا تھا۔ نہیں' ہرگز نہیں۔ آج وہ جس مقام پر تھا' وہ صرف اللہ کا فضل اور مہربانی تھی۔ اس نے تو صرف تھوڑی سی محنت کی تھی۔ ماں کی نیکیوں کے صلے میں اسے اللہ تعالیٰ نے اس منصب تک پہنچایا تھا اور وہ کس طرح اللہ کی نوازش اور مہربانی کو فقط اپنی تگ و دو کا نتیجہ سمجھ رہا اور دوسرے لوگوں کو کس طرح کمتر محسوس کرتا تھا۔ خاص طور پر زرتاج۔

اس وقت جب ڈاکٹر فہد نے اسے بتایا کہ وہ جلد ہی اپنی والدہ کو زرتاج کے گھر بھیجے گا تو اس نے خاصا چڑ کر کہا۔

"خوامخواہ ہی اس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ ہو سکتا ہے وہ پہلے سے ہی انگیج ہو یا اس کا نکاح ہو چکا ہو۔"

"لو خوامخواہ ہی۔" فہد خاصا برا مان گیا۔ "بدفالیں تو منہ سے نہ نکالو۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو سب کو پتا چل جاتا۔"

"اچھا جو بھی ہے' بس تم اس کا پیچھا چھوڑ دو۔"

"کیوں' تمہیں کیا تکلیف ہے؟" وہ جھنجلا سا گیا۔

"تکلیف مجھے یوں ہے کہ وہ میری کزن ہے اور نہ صرف کزن ہے بلکہ ہمارا نکاح بھی ہو چکا ہے۔" ڈاکٹر فہد بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گیا۔

"ڈاکٹر زرتاج تمہاری..... منکوحہ ہے؟ نہیں یار! تم مذاق کر رہے ہو۔" اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

"کہو تو لکھ کر دے دوں۔" اس کے یقین نہ کرنے پر وہ چڑ گیا۔

"یار! بڑے کمینے ہو تم' پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں پتا نہیں کیا اول فول بکتا رہتا تھا۔ اگر بتا دیتے تو کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔" اس نے خاصی شرمندگی سے کہا۔

☼ ☼ ☼

ایک تو وہ خود اتنا مصروف تھا کہ گھر میں صرف سونے کے لیے ہی جاتا تھا اور بعض دفعہ تو رات بھی اسپتال میں ہی گزارنا پڑتی۔ جتنا وقت وہ گھر میں موجود ہوتا زرتاج جانے کس کونے کھدرے میں چھپی رہتی۔ وہ اسے اگر ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتا تو ناکام ہو جاتا۔ ہاں ردا اور ثوبیہ کی شادی میں جب اس نے گھر زیادہ وقت گزارا تھا تو زرتاج سے بھی کئی بار سامنا ہوا مگر اس نے کبھی عزم کو قابل اعتنا نہیں جانا۔ اس کے سامنے سے کسی اجنبی کی طرح گزر جاتی۔ حارث' فرحان' ابا اور اماں کے سارے کام سرانجام دیتی مگر اسے کبھی پانی تک پلانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ایک وقت تھا' وہ خود بھی تو یہی چاہتا تھا' اس کے ہاتھ سے لی ہوئی کوئی چیز کھانا نہیں چاہتا تھا مگر اب اس کی بے توجہی نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ مہندی وغیرہ کی تقریب میں جب زرتاج اور دوسری لڑکیاں ہلا گلا کر رہی ہوتیں' گانے گاتیں اور حارث بھی ان سب کے ساتھ سر میں سر ملاتا ایسے میں اگر عزم انجوائے کرنے کے لیے اس محفل میں آ جاتا تو وہ سب اس کے احترام میں خاموش ہو جاتے۔ اس طرح جیسے ان سب کو سانپ سونگھ گیا ہو' عزم کا دل چاہتا وہ اس کے سامنے بھی ہنسیں' کھلکھلائیں اور گانے گائیں' اپنے منہ سے کہتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہوتی اس لیے وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ جاتا۔

ردا اور ثوبیہ رخصت ہو کر چلی گئیں' گھر میں خاموشی سی در آئی' وہ دونوں عزم کی تمام ضروریات کا خیال رکھتی تھیں' اگر وہ آدھی رات کو بھی آتا تو کوئی نہ کوئی بہن جاگ رہی ہوتی' جو اسے کھانا گرم کر کے دیتی صبح ناشتہ بھی وہی بنا کر دیتیں' اماں تو اپنے گھٹنوں کے درد کی وجہ سے لاچار ہو گئی تھیں۔ ردا اور ثوبیہ کے جانے کے بعد سب سے زیادہ پریشانی عزم کو ہی ہوئی تھی۔ صبح ناشتہ تو مل جاتا' کام والی کمرہ بھی صاف کر جاتی' کپڑے بھی پریس کیے ہوئے مل جاتے' مگر جب وہ رات کو دیر سے گھر آتا تو اکثر ہی بھوکا سو جاتا' گیٹ کی چابی اس کے پاس بھی ہوتی تھی۔ اکثر ہی اسے آتے آتے ایک ڈیڑھ بج جاتا' اگر اس میں ہمت ہوتی تو کھانا گرم کر کے کھا لیتا ورنہ بھوکا ہی سو جاتا۔

اس دن بھی وہ صرف ناشتہ کر کے گیا تھا مصروفیت کی بنا پر دوپہر میں بھی صرف ایک سینڈوچ کھایا تھا اور گھر آتے آتے ساڑھے بارہ بج گئے ایک تو تھکن پھر بھوک..... بہت ہی ابتر حالت ہو رہی تھی اس کی منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس نے کچن کا رخ کیا۔ خلاف معمول کچن کی لائٹ آن تھی اور اندر سے کسی کے بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ جس وقت اس نے کچن کی چوکھٹ پر قدم رکھا' زرتاج چھوٹی ٹیبل کے سامنے بیٹھے حارث کے آگے گرم گرم بریانی کی پلیٹ رکھ رہی تھی' عزم کا دل جل کر خاک ہو گیا "یعنی بیوی میری ہے اور خاطرداریاں حارث کی کی جاتی ہیں' میں ٹھنڈا اور باسی کھا کر سو جاتا ہوں' اور..... وہ....."

نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اس نے خود کو کچھ بھی تلخ بولنے سے روکا اور اندر آ گیا۔ اس دوران حارث کی نظر اس پر پڑ چکی تھی۔

"ارے بھائی جان! آپ آئیں نا' کھانا کھا لیں بڑی مزیدار بریانی ہے اور آپ کو بھوک بھی لگ رہی ہو گی۔" حارث نے کھڑے ہو کر اسے کرسی پیش کی۔

عزم تنے ہوئے چہرے کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔

حارث' اپنی پلیٹ اس کے آگے رکھتے ہوئے زرتاج سے بولا۔

"میرے لیے اور چاول گرم کر دو۔"

اس نے چپ چاپ برنر جلایا اور کھانا گرم کرنے لگی۔ عزم کو بھوک اتنی شدید لگ رہی تھی کہ اس نے فوراً ہی کھانا شروع کر دیا تھا۔ جبکہ زرتاج اسی خاموشی سے حارث کے آگے کھانا رکھ کر کچن سے باہر چلی گئی۔ کھانے کے بعد عزم کو چائے کی طلب ہو رہی تھی حارث نے اپنے اور اس کے چائے بنائی۔ زرتاج نے تو پلٹ کر خبر ہی نہ لی تھی۔

بس اس دن کے بعد سے عزم اس کی ہر بات نوٹ کرنے لگا تھا۔ صبح ہی صبح وہ ابا حارث اور فرحان کو ناشتہ کراتی' ان کے جوتے موزے تیار رکھتی' کپڑے پریس کر کے ان کے ہاتھوں میں پکڑاتی' ساتھ ساتھ نوک جھونک بھی جاری رہتی' اور وہ اپنی ساری تیاری خود کرتا۔ جب کمرے سے باہر آتا تو تخت پر ناشتہ تیار رکھا

ہوتا۔ وہی بوائل انڈا، سلائس، مکھن اور ایک کپ دودھ ایک ہی روٹین، کبھی اس سے اس کی پسند پوچھنے کی توفیق نہ ہوئی۔

اماں وہیں تخت پر ہی موجود ہوتیں۔ اسے صحیح طرح سے ناشتہ کرنے کی تلقین کرتے ہوئے۔ کمرے میں ہوتا تو حارث اور فرحان کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑتی رہتیں۔

"باجی! مجھے اچھا سا پراٹھا بنادو، زری! پلیز میرے لیے قیمہ بھی بھون دینا، اور ہاں ایک کپ اسٹرانگ سی چائے۔"

یہ اور اسی قسم کی دوسری فرمائشیں۔ جب وہ ان باتوں پر غور کرنے لگا تو کڑھنے کی عادت خود بخود ہی پڑ گئی۔

"ذرا احساس نہیں ہے میرا، چیزیں اٹھا اٹھا کر پٹختا، جھنجلاتا، تنتناتا ہوا، اماں کے سر پر جا کھڑا ہوتا۔

"اماں! میرے موزے نہیں مل رہے۔ کمرہ گرد سے اٹا ہوا ہے۔ یار رات کو بھی ٹھنڈا کھانا کھا کر سویا تھا اور پرسوں رات تو کھانا ہی نہیں کھایا، بھوکا رہ رہ کر کمزور ہو رہا ہوں میرا تو کوئی پرسان حال ہی نہیں ہے، صبح ایک ہی جیسا ناشتہ کر کر کے دل اوب گیا ہے۔" وہ بچوں کی طرح بسور رہا تھا۔

اماں نے بڑی بے چارگی کے ساتھ اسے دیکھا۔

"بچے! کیا کروں، یہ گھٹنوں کا درد کھڑا ہی نہیں ہونے دیتا، ورنہ میں کیا کچھ نہ کرتی تیرے لیے۔" اماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"اُفوہ۔۔۔" وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ "اماں آپ کی کوئی عمر ہے یہ سب کرنے کی۔"

"پھر۔۔۔ پھر کون کرے گا؟" زرتاج کا نام لبوں تک آتے آتے رہ گیا وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ اماں بھی جان بوجھ کر انجان بن گئیں۔ ان کی بھی ایک ہی ضد تھی کہ جب تک وہ خود اپنے منہ سے نہ کہے گا۔ وہ کچھ بھی نہیں کریں گی آخر کو وہ بھی اس کی ماں تھیں۔

ویسے تو اسے فراغت کم ہی نصیب ہوتی تھی مگر جمعہ والے دن اتفاق سے اسے گھر میں رہنے کا موقع مل گیا اور یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ زرتاج بھی گھر پر ہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ اماں نیچے لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی تھیں وہیں ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے کارپٹ پر بیٹھی زرتاج دھیمی آواز میں ان سے باتیں کر رہی تھی تب ہی عزم کے کمرے سے دھڑام دھڑوم کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ جب کافی دیر تک چیزوں کی اٹھا پٹخ بند نہ ہوئی تو اماں نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے آواز دی۔

"کیا بات ہے عزم! کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" کمرے سے نکل کر وہ گرل کے پاس آکھڑا ہوا۔

"اماں! ایک فائل گم ہو گئی تھی، وہ ڈھونڈ رہا تھا۔ سارا کمرہ الٹا ہو گیا ہے، کسی سے کہیں سمیٹ دے۔"

اور کسی کون تھا یہ اماں بخوبی جانتی تھیں۔

"جا بیٹا! جا کر دیکھ کمرے کا کیا حشر کیا ہے۔"

"اماں! میں۔"

وہ بڑبڑائی۔ "بری بات ہے بیٹا! آخر کو تم۔۔۔"

"اماں پلیز۔" اس کا گریز دیکھ کر عزم نیچے آگیا۔ اس پر نظر ڈالے بغیر زرتاج تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ کمرے میں جا کر سب سے پہلے کمرہ لاک کیا اور پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ کمرے کو پورا کباڑ خانہ بنا کر گئے تھے موصوف، بیڈ کی چادر، تکیے، کمبل اور وارڈ روب کے کپڑے ساری چیزیں زمین بوس تھیں۔ اس نے سب سے پہلے بیڈ پر چادر بچھائی، تکیے رکھے پھر کشن سمیٹے، کمبل تہہ کیا۔ پھر کپڑے تہہ کر کے الماری میں رکھتے ہوئے اچانک اسے سات سال پہلے کا وہ منظر یاد آگیا، جب عزم نے اس کے ہاتھ سے کپڑے چھین کر پھینک دیے تھے۔ عزم کے اس دن کے رویے نے اسے کتنا تڑپایا تھا۔ کتنے ہی دنوں تک وہ روتی رہی تھی اور اس نے عہد کیا تھا کہ وہ عزم کے پاس کبھی نہیں جائے گی۔ مگر اس دل کا کیا کرتی جس پر پہرے بٹھاتے بٹھاتے وہ ادھ موئی ہو گئی تھی۔

دوسری طرف چند منٹوں بعد ہی عزم اوپر آگیا۔ دروازہ دھکیل کر اندر آنا چاہا تو لاک نے اس کا منہ چڑایا۔ بری طرح سے کھول کر رہ گیا زور سے دو چار ہاتھ دروازے پر مارے۔ زرتاج اچھل کر رہ گئی۔ بادل

دروازہ کھولنا پڑا۔ دروازے کو دھکا دے کر وہ اندر داخل ہوا زرتاج نے کترا کر باہر نکلنے کے قدم بڑھائے۔ عزم کا پارہ ایک دم ہائی ہو گیا۔ اسے دبوچ کر اندر کھینچا اور بیڈ پر پٹخ دیا۔ زرتاج ہراساں ہو گئی۔ اس کے ریشمی بال جو ہلکے سے جوڑے میں تھے، کھل کر بیڈ پر پھیل گئے۔ آسمانی چادر پر سونا سا بکھر گیا، عزم مدہوش ہو گیا۔ وہ کہنیوں کے سہارے ذرا سا اوپر ہو کر خوفزدہ نظروں سے عزم کو دیکھنے

"کیوں دور بھاگتی ہو مجھ سے اتنا، کیوں کتراتی ہو اتنا، میں کوئی غیر نہیں، تمہارا شوہر ہوں۔" بیڈ پر دونوں ہاتھ اس کے اطراف رکھ کر جھکتے ہوئے خمار آلود لہجے میں کہا گیا، اس کی شرٹ سے اٹھتی خوشبو زرتاج کے بھی حواس چھیننے لیے جا رہی تھی، مگر اس نے بہت جلد خود پر قابو پا لیا، اسے دونوں ہاتھوں سے دھکیلتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کس نے کہا کہ آپ میرے شوہر ہیں؟"

"ساری دنیا کہتی ہے۔" وہ اس کے بالوں کی لٹ کو لپیٹتے ہوئے اس نے اطمینان سے کہا تھا۔

"دل کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ آپ نے تو اس کو تسلیم نہیں کیا تھا، آپ نے تو امریکہ پہنچتے ہی طلاق بھجوانا تھی کیا ہوئیں وہ ساری باتیں۔" وہ ذلت، وہ توہین، لمحہ بھر میں وہ سارے منظر زرتاج کی آنکھوں کے سامنے آگئے تو اس کا دل بھر آیا۔

"آپ تو کہتے تھے کہ آپ مرجائیں گے مگر میرا ساتھ قبول نہ کریں گے۔" عزم نادم سا ہو گیا۔

"ان سب باتوں کو بھول جاؤ زرتاج!" ساری زندگی میں زرتاج نے پہلی بار اس کے منہ سے اپنا نام سنا تھا۔ آج سے پہلے اپنا نام اسے کبھی اتنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اس کے لہجے کی حلاوت اور چاہت نے اس کے نام کو وہ خوبصورتی عطا کی تھی کہ زرتاج کے سارے شکوے جاتے رہے۔ مگر کمزور سا احتجاج تو کرنا ہی تھا۔

"کیوں بھول جاؤں ان باتوں کو، وہ باتیں تو میرے دل پر نقش ہیں۔"

"پلیز زری! میری بات سمجھو ناں۔ اس وقت میرا دماغ خراب تھا۔ مجھے اپنے آپ پر بہت ناز تھا، میں خود کو بڑی چیز سمجھتا تھا۔"

"اور اب۔۔۔ اب کیا ہوا؟"

"اب یہ کہ میں بھی اللہ کا بندہ اور تم بھی اللہ کی بندی، حساب برابر، نہ کوئی بڑا نہ چھوٹا۔" اس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر پھر اس کے بال کھینچے۔ "اور ان تمام باتوں کے لیے جن سے تمہارے کو دل رنج ہوا اس کے لیے سوری۔"

"کیا آپ کے اس طرح سوری کہنے سے آپ کے الفاظ نے جو گھاؤ ڈالے ہیں کیا وہ مٹ جائیں گے۔" اس سے دور ہوتے ہوئے زرتاج نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"تو پھر تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں، کیا ناک رگڑوں تمہارے آگے۔ یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاؤں کہ دیوی جی معاف کردیں۔"

اس نے چبا چبا کر کہا تھا۔ زرتاج کے ماتھے پر بھی بل پڑ گئے۔ اسے غصے سے گھورتے ہوئے وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی، مگر۔۔۔ اس کی کلائی پھر عزم کے ہاتھ میں تھی۔

"اتنا نخرہ کیوں دکھا رہی ہو، ابھی اماں سے جا کر کہتا ہوں کہ کل ہی رخصتی کروادیں، پھر تو۔۔۔"

"تو جائیں ناں، کہیں اماں سے۔ مجھ پر کیا رعب ڈال رہے ہیں۔" ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر وہ کمرے سے نکل بھاگی۔ وہ بھی باہر نکل آیا۔ زرتاج آخری سیڑھی پر کھڑی اپنی بے ترتیب دھڑکنوں کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ عزم نے وکٹری کا نشان بنایا اور زرتاج نے سرخ ہو کر سر کھجانا شروع کر دیا۔ عزم زور سے ہنس پڑا۔ فطرت کبھی بدل نہیں سکتی مگر اب اس کا اپنا ذہن تبدیل ہو چکا تھا! اس لیے اسے گھن نہیں آئی تھی بلکہ اسے یہ حرکت بھی محبوب کو ایک ادا ہی لگی تھی۔